آخری شکار

مروہ خان

آخری شکار

از مروہ خان

(ناولٹ)

انتساب:

ذہن میں گونجتی اس آواز کے نام جس نے مجھے یہ مسودہ تحریر کرنے پر آمادہ کیا۔اور مجھے یہ باور کروایا کہ اس دنیا میں میرے جیسے اور بھی کئی لوگ موجود ہیں۔

انتباہ:

یہ کہانی کن کے لیے ہے؟ وہ جو افسانے کو محض افسانے کے طور پر پڑھتے ہیں۔ جنہیں ہولناک تفصیلات پر مبنی سطر پڑھ کر ابکائی نہیں آتی اور جو۔۔۔ اس کہانی کے لکھاری کی طرح سائیکولوجیکل تھرل کے شوقین ہیں۔ وہ جو abyss کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہیں، بغیر اس خوف کے کہ جب آپ abyss میں جھانکتے ہیں تو وہ بھی پلٹ کر آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

"When you look into an abyss, the abyss also looks into you."

—Friedrich Nietzsche

جو ظلم سہو گے تم

اس کی ابتدا ہوں میں

جو خوف محسوس کرو گے تم

اس کی انتہا ہوں میں

موت کی ہچکی لینے سے قبل

سماعت کے صلب ہونے سے قبل

آنکھوں کی حرکت تھمنے سے قبل

جسم کے شل ہونے سے قبل

جو آخری منظر دیکھو گے تم

وہ منظر ہوں میں

کیونکہ میرا شکار ہو تم

اور

تمہارا شکاری ہوں میں

"اور مزید کتنی دیر لگے گی؟" میں نے اکتائے ہوئے انداز میں دروازے کی چوکھٹ کے پار کھڑی باوردی اہلکار سے پوچھا۔

اس کمرے کی ویرانی میں میری آواز گونجتی ہوئی سنائی دی تھی۔

ہمارے درمیان آہنی سلاخوں والا ایک قد آور دروازہ حائل تھا۔ جس کی دوسری جانب مکمل سکوت کا راج تھا۔

یہاں کے درودیوار ہمیشہ ساکن، تماشائی بنے رہتے ہیں۔ ان چار دیواروں کی موجودگی میں جن رازوں پر سے پردے اٹھے تھے اگر کو ایک لمحے کے لیے یہ دیواریں جاگ جاتیں تو ان کی چیخ و پکار یہاں موجود ہر ذی روح کا دل دہلا دینے کے لیے کافی ہوتیں۔

اس موٹی چھوٹی عورت کو میرا سوال کرنا پسند نہیں آیا تبھی اس نے بھونیں سکیڑتے ہوئے نگاہوں کا زاویہ بدلا۔

جب سے میں یہاں آئی ہوں اس عورت نے کبھی مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ مجھ سے خائف تھی۔ اور اسے ہونا بھی چاہیے۔

اس کمرے کو میں پچھلے تین مہینوں میں ان گنت بار دیکھ چکی ہوں۔ وہی شگاف زدہ دیواریں جن سے ہر دم نحوست ٹپکتی رہتی، وہی تیز پاور والے آنکھوں میں چبھتے بلب جن کی روشنی سے میری آنکھیں ہر بار چندھیا جاتیں اور یہ مکروہ فرنیچر۔ اگر تو اسے فرنیچر کی کیٹیگری میں ڈالا جا سکے تو۔

ایک بھاری زنگ آلود میز اور اس کے آمنے سامنے رکھیں دو کرسیاں۔ ان میں سے ایک پر ابھی میں براجمان تھی۔

جب بھی میں پہلو بدلتی تو کرسی ایسے دہائی دیتی جیسے اگلی بار مجھے یہ یہاں دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ لیکن ہر بار میری خوش فہمی زیادہ عرصے نہیں ٹک پاتی۔

میں نے دونوں ہاتھ میز پر دھر دیے۔ کلائی میں موجود ہتھکڑی نے دھات پر دھات کے لگنے کی جو ناقابل سماعت آواز پیدا کی تھی اس سے ایک لمحے کو میری نگاہوں کے سامنے مختلف مناظر لہرائے تھے۔

اندھیرا کمرہ۔۔ ایک دروازہ۔۔ بھاری اوزار۔۔اور ایک چیخ۔۔

میں نے سر کو کرسی کی پشت پر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

اس کمرے کا ایک دروازہ میری پشت پر کھلتا تھا۔ لیکن وہاں سے صرف میں اندر داخل ہوتی تھی، اور وہیں سے مجھے لے جایا جاتا تھا۔

میری دائیں جانب ایک بڑی کھڑکی تھی۔ جس کے پٹ اس وقت کھلے تھے۔ اس سے دن کی روشنی اندر جھانک رہی تھی۔

یہاں کوئی گھڑی نہیں تھی اور ویسے بھی گھڑی کی ضرورت کسے جب ہر دن ایک سا ہو؟

اگر تمہیں کبھی ایسا محسوس ہو کہ زندگی دوڑ رہی ہے اور تم پیچھے رہ گئے ہو، تو ایک بار خود کو تنہائی میں قید کر لینا۔ تمہیں احساس ہو گا کہ وقت تھم سا گیا ہے۔ خلوت کے لمحات انسان کو اس کی اصل اوقات یاد دلاتے ہیں۔ اگر تمہیں زعم ہے کہ دنیا تمہارے ساتھ چلتی ہے، تو یقین جانو اکیلے پن کا خوف تمہارے حواس ٹھکانے لگا دے گا۔

کھڑکی کی دوسری جانب سلاخوں کے پار تمہیں ایک وسیع و عریض میدان نظر آئے گا۔ یہاں مختلف عمارتیں بھی ہیں اور ان سب کے گرد اونچی چار دیواری بنائی گئی ہے جس کی سطح پر خار دار تاروں کا احاطہ ہے۔

اس جگہ کے چاروں کونوں پر چوکیاں تعمیر ہیں جن میں مسلح اہلکار چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر مامور رہتے ہیں۔

انہیں لگتا ہے یہ انتظامات ہمیں باقی دنیا سے دور رکھ سکتے ہیں۔

کیوں؟

تاکہ اس حد بندی کی دوسری جانب موجود لوگ محفوظ رہ سکیں۔

انسان کی سب سے بڑی کمزوری اس کا خوف ہے۔ جب خوف اس پر طاری ہو جائے تو وہ یا تو اس چیز کو قید کر کے رکھتا ہے جو اس کے خوف کا باعث بن رہی ہوتی ہے یا پھر وہ خود کو قید کر لیتا ہے۔

دونوں صورتوں میں مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ اپنے اور اس خوف پیدا کرنے والی چیز کے درمیان فاصلہ قائم کرنا۔

لیکن کیا ہوا گر تم خود کو اپنے خوف کے ساتھ ایک جگہ قید کر لو؟ کیا تم جیت پاؤ گے؟ یا تمہارا خوف تم پر بازی لے جائے گا۔

ہمیں یہاں قید رکھ کر یہ باقیوں کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس امر میں یہ لوگ یہ بات سراسر نظرانداز کر گئے کہ انہیں ہم سے محفوظ کون رکھے گا؟

یہ سب کتنا مضحکہ خیز تھا۔ یہ لوگ کتنے احمق تھے۔

تم کسی کو شکار کرنے سے کس طرح روک سکتے ہو؟ خاص طور پر جب اس کا شکار ہی انسان ہوں۔ اس کے لیے شاید انہیں مجھے کسی بیابان جزیرے پر قید کرنا ہوگا۔

تم شاید میری کیفیت نہ سمجھ سکو لیکن تمہیں کچھ کچھ اندازہ تو ہو رہا ہو گا نا؟

یہ لوگ سفید کوٹ پہنے، کھسکے ہوئے سائنسدان ہیں اور ہم ان کی لیبارٹری میں موجود پنجروں میں قید چوہے۔

سامنے کی راہداری سے آتی مانوس پیروں کی چاپ پر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

بلآخر وہ آگیا تھا۔

میرا مسیحا۔

میرا ستم گر۔

میرا سائنسدان۔

نا چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ نے میرے لبوں تک رسائی حاصل کرلی۔

"بہت دیر کر دی مہرباں آتے آتے۔"

اس کے ہیولے کو چوکھٹ پار کرتا دیکھ میں گنگنائی۔

آہنی سلاخدار دروازہ چند لمحوں کے لیے کھلا تھا۔اس سے زیادہ دیر یہاں کی انتظامیہ میں اسے کھلا رکھنے کی سکت نہیں تھی۔

وہ چوکھٹ پار کر سکتا تھا۔وہ ان چند گنے چنے لوگوں میں سے تھا جنہیں یہ حق حاصل تھا۔

اس موٹی چھوٹی عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا۔

مجھے بھی نہیں تھا۔

لیکن اسے تھا۔

کیونکہ وہ۔۔۔

وہ ہمدان واصف تھا۔

سفید بٹنوں والی شرٹ کے ساتھ سیاہ پتلون پہنے وہ ویسا ہی لگ رہا تھا جیسا پچھلے ہفتے میں نے اسے دیکھا تھا۔

اچھی بات ہے۔

وہ بدلتا نہیں ہے۔

اور مجھے بدلاؤ پسند نہیں۔

شاید وہ یہ بات جانتا ہے۔ جبھی تو وہ ہمیشہ اسی کرسی پر بیٹھتا ہے جس کی پشت اس راہداری کی جانب ہو۔ اسی لیے وہ وہی بھورا چرمی بیگ لاتا ہے جو اس نے پہلی ملاقات میں ہمارے درمیان رکھا تھا۔

وہ مجھے جانتا ہے۔

ایک مسکراہٹ چہرے پر سجائے میں نے اس کا خیر مقدم کیا۔

چھوٹے چھوٹے قدم لیتا وہ اب اس خالی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گئی۔ میں اس کے سوالات کے لیے تیار تھی۔

اس کے کشادہ ماتھے کے درمیان ایک ہلکی شکن مجھے بتا چکی تھی کہ وہ اس وقت میرے لیے کیا سوچ رہا ہے۔

اس کی بھوری آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ پرکھ رہیں تھیں۔

مجھے اچھا لگتا ہے جب وہ مجھے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بھلے ہی کامیاب نہیں ہو پاتا، مگر وہ کوشش تو کرتا ہے۔

جب جب اس کی آنکھیں سکڑ جاتیں۔ اس کی باریک بھونیں اوپر کو اٹھتی اور اس کی نظریں مجھے ہر زاویہ سے سمجھنے کی کوشش کرتیں۔ جیسے میں اس دنیا کا سب سے خوبصورت اور پیچیدہ ترین معمہ ہوں اور وہ مجھے ہر قیمت پر سلجھانا چاہتا ہو۔

لیکن پھر بھی وہ آج تک مجھے اس طرح نہیں سمجھ پایا جس طرح میں چاہتی ہوں۔ وہ میری شخصیت کی گہرائیوں میں اتر تو جاتا ہے مگر وہاں مدفن رازوں کو ڈھونڈ نہیں پاتا۔

اس نے ایک لمبی سانس خارج کرتے ہوئے اپنے اندر ہونے والی ہلچل کو پر سکون کیا۔

"یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ آج کے بعد ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملیں گے۔"

اس کا لہجہ کس قدر دھیما تھا مگر اس کے الفاظ۔

مجھے آج تک کسی نے تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔

بلکہ یوں کہوں کہ میں نے کبھی کسی کو اس قابل چھوڑا نہیں تھا کہ وہ مجھے تکلیف دے سکے۔

لیکن اس وقت ہمدان واصف مجھے تکلیف دے رہا تھا۔

اپنے الفاظ سے۔

اپنے رویہ سے۔

اپنی نگاہوں کی تپش سے۔

اور اس احساس سے کہ اس کے پاس کسی قسم کا کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔

"میں نے تمہیں تنبیہ کی تھی کہ تم دوبارہ کسی پر بھی تشدد نہیں کرو گی۔"
وہ کہہ رہا تھا۔ اور اس کی آواز میرے چاروں اور گونج رہی تھی۔

"لیکن تم نے پھر سے۔۔ تم باز کیوں نہیں آتیں؟"
اس نے تنک کر سوال کیا۔

کرسی پر اس کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ کیا وہ کرسی اٹھا کر مجھے مارنا چاہتا تھا؟

وہ مجھے تیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں طیش تھا۔ میں نے پہلے کبھی اسے اتنا ناراض نہیں دیکھا تھا۔ وہ کبھی مجھ پر غصہ نہیں ہوا تھا۔ یہ اس کے پیشے کے بر خلاف تھا۔

میں ساکت بیٹھی رہی۔ میری خاموشی اسے چبھ رہی تھی۔

"جواب دو۔ میں تم سے بات کر رہا ہوں۔"

اس کی آواز بلند ہوئی، وہ جھلایا۔

غنیمت تھا کہ یہ در و دیوار آج بھی خاموش رہیں۔

اس موٹی چھوٹی عورت نے تعجب سے ہماری جانب دیکھا۔

اس وقت وہ مجھے سخت زہر لگ رہی تھی۔ اگر اس نے آج کا اپنا مجھے اکسانے کا کوٹا مکمل کر لیا ہو تو ٹھیک، ورنہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ میرا اگلا شکار ہو گی۔

"کیا کوئی سانس لینے سے باز آتا ہے؟"

میں نے دنیا جہاں کی معصومیت اپنی آنکھوں میں سماتے ہوئے دریافت کیا۔

ہمدان نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔اس کی بھنویں کے بیچ کی شکن مزید گہری ہوئی۔

"اس نے میری کھانے کی ٹرے فرش پر پھینک دی تھی۔"
میں نے پہلی بار وضاحت پیش کرنی چاہی۔

البتہ میری نظریں ہنوز ہمدان پر ٹکی تھیں۔

"اور؟ تم نے اس کی کھوپڑی کچل دی؟"
وہ کچھ عجیب سے انداز میں بولا۔جیسے اسے مجھ سے کسی اور ردعمل کی توقع تھی۔

کیا اسے اس عورت کے لیے افسوس ہو رہا تھا؟

اس خیال کے آتے ہی مجھے اپنے سینے میں ایک گراہ لگتی محسوس ہوئی تھی۔

"تمہیں پتہ ہے وہ اس وقت آئی سی یو میں ہے ؟اگر چوبیں گھنٹے میں اسے ہوش نہیں آیاتو وہ برین ڈیڈ قرار دے دی جائے گی۔"

آہ۔ تو وہ ابھی تک زندہ تھی۔ بہت موٹی چمڑی ہے اُس کی۔

موٹی چمڑی سے یاد آیا وہ موٹی چھوٹی عورت ابھی بھی ہمیں گھور رہی تھی۔

میں نے غیر محسوس کن انداز میں مٹھی بھینچی جیسے میری ہتھیلی کے درمیان اس کی گردن جکڑی ہو۔ اور میں دھیرے دھیرے اس کی سانس کی نالی پر اپنی گرفت مضبوط کر رہی ہوں۔

"اس کے بعد تمہاری سزا میں مزید اضافہ کر دیا جائے گا۔ تمہیں اس بات کا علم ہے ؟اور بات میڈیا میں پھیل گئی تو ؟"

ہمدان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں نے مٹھی ڈھیلی کر دی۔

وہ مجھے کم عقل تو نہیں سمجھتا۔ پھر کیوں پوچھ رہا ہے ؟

"میں پہلے ہی عمر قید کی سزا کاٹ رہی ہوں۔"

میں نے شانے جھٹکے۔

"اب تمہاری اپیل کا حق بھی تم سے چھن جائے گا۔"

وہ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔

میں نے ایک قہقہہ لگایا۔

"تمہیں لگتا ہے یہ لوگ مجھے اپیل کرنے دیتے؟"

پھر میں کرسی پر تھوڑا آگے ہو کر بیٹھ گئی۔

"بلکہ تم مجھے ایک بات بتاؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے باہر نکلوں؟"

مجھے بدلاؤ پسند نہیں مگر اس شخص کے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔

کچھ مختلف بھی۔

اس نے ایک ہاتھ سے ماتھے پر آتے بالوں کو پیچھے کیا۔

اس کی نگاہیں ہر طرف دیکھ رہی تھیں، سوائے میرے۔

اسے صرف "ہاں" کہنا ہے۔

اس کی ایک "ہاں" سب کچھ بدلنے کی طاقت رکھتی ہے۔

مگر اس نے ایسا نہیں کہا۔

"میں کیا چاہتا ہوں اور کیا نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سچ یہ ہے کہ تم نے میری تین مہینے کی کارکردگی پر پانی پھیر دیا ہے۔"

اس نے شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ایک لمحے پہلے کی جھجک اور ہچکچاہٹ کہیں غائب ہو گئی تھی۔

"جیل انتظامیہ ہمارے انٹرویوز کو روکنا چاہتی ہے۔ انہیں یہ سب بے سود معلوم ہوتا ہے۔ اگر تم صرف ایک بار، ایک بار اس عورت کا سر کچلنے سے پہلے اس سب کے بارے میں سوچ لیتی تو۔۔"

اس نے جملہ دانستہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے دوبارہ سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"ہمارے انٹرویوز ختم ہو بھی جائیں تو بھی تم سے کوئی یہ اعزاز نہیں چھین سکتا کہ تم نے ہمارے ملک کی خطرناک ترین قیدی کو تین مہینے کسی کا خون بہانے سے روکے رکھا۔"

"یہ تو خود میں ایک معجزہ ہے۔"

میں نے بات مکمل کر کے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

اسے خود پر ناز ہونا چاہیے تھا۔

اسے مجھ پر فخر ہونا چاہیے تھا۔

لیکن اس کی آنکھوں میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔

"تم کال کوٹھری سے زیادہ دن دور نہیں رہ سکتیں نا؟"

اس کے ہونٹوں کے کونے اوپر کو اٹھے۔

میں نے ایک آہ بھری۔

"کیا کروں۔ وہاں کی تنہائی مجھے ہر بار اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔"

بلکل تمہاری طرح۔

"تم ایک بہت اچھی اداکارہ ہو۔"

کہتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا چرمی بیگ میز پر رکھ دیا۔

"اگر تم نے یہی رویہ رواں رکھا تو وہ دن دور نہیں کہ تم کسی پاگل خانے کے بیڈ پر رسیوں سے جکڑی پائی جاؤ۔ جہاں کوئی سر پھرا ڈاکٹر ایک بٹن دبا کر تمہیں الیکٹرک شاک کے ذریعے ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سلا دے۔"

اس نے یہ سب ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا۔

"اگر ایسا ہو تو میں چاہوں گی اس سر پھرے ڈاکٹر کی جگہ تم وہاں موجود ہو۔ تاکہ اپنی آخری سانسیں لیتے وقت میں تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس دنیا سے رخصت ہو سکوں۔"

لگے ہاتھوں میں نے بھی موقع کا فائدہ اٹھایا۔

اب ماحول کی کشیدگی بلکل زائل ہو گئی تھی۔

ہماری ملاقاتوں کی یہی بات تو مجھے سب سے زیادہ پسند تھی کہ ہم جہاں ملاقات چھوڑ کر جاتے اگلی ملاقات اس کو یوں آگے بڑھاتی جیسے درمیان میں کبھی رکی ہی نہ ہو۔

"تم سائیکو ہو۔ پوری طرح سائیکو۔"
اس نے شہادت کی انگلی اپنی کنپٹی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اور تمہیں میری سائیکوپیتھک شخصیت سے لگاؤ ہے، میں نے صحیح کہا؟"

میں نے ابرو اچکائی۔

پچھلے تین مہینوں میں ہمدان نے میرے مختلف اقسام کے دماغی ٹیسٹ کیے تھے۔

میں ایک سرٹیفائیڈ سائیکوپیتھ ہوں۔

مجھے ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں، خون کی چھینٹوں کی تپش، انسانی جسم کی دھیرے دھیرے سڑنے پر پیدا ہونے والی بُو اور۔۔۔ ہمدان پسند ہیں۔

مجھے یہاں ۱۲ لوگوں کو بے دردی سے تشدد کے بعد قتل کرنے پر لایا گیا تھا۔

"نہیں۔ مجھے تم سے یا تمہاری شخصیت سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ میں محض ریسرچ کی غرض سے یہاں ہوں۔"

وہ اتنی ہی آسانی سے جھوٹ بول رہا تھا جتنی آسانی سے میں بولتی ہوں۔ لیکن میں ایک pathological جھوٹی کے طور پر مشہور ہوں۔ اور ہمدان۔۔۔

"چونکہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے آخری شکار کے بارے میں بتاؤ۔"

اس نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ دیے، جیسے اس کی بات مکمل ہو گئی ہو اور میرے پاس انکار کرنے کا کوئی جواز نہ ہو۔

اس کی بائیں ہاتھ کی انگلی میں چاندی کا چھلا روشنی پڑنے پر ایک مغرور سے انداز میں چمکا تھا۔

وہ کتنا خود غرض تھا۔

بلکل میری طرح۔

"ان پر کیے جانے والے تشدد کی داستان تم اور کتنی بار سننا چاہتے ہو؟"

میں ۱۲ لوگوں کو قتل کر چکی ہوں بقول پولیس کی تفتیش کے۔

میں نے کبھی ۱۲ کے ہندسے کا دعوہ نہیں کیا کیونکہ میرے گھر میں موجود ناخن اور بالوں کا کوئی حساب نہیں تھا۔

"مجھے لگتا ہے آخری شکار تک تمہارا طریقہ واردات بدل گیا تھا۔ مجھے اس میں دلچسپی ہے۔"

وہ یہ بات پہلے بھی کئی بار دہرا چکا تھا۔

میں اس کے تجسس کو کم نہیں کروں گی کیونکہ یہ ہماری آخری ملاقات نہیں ہے۔ ہماری کون سی ملاقات آخری ہو گی اس کا تعین صرف میں کروں گی۔

وہ آج بھی یہاں سے خالی ہاتھ لوٹے گا۔ مگر وہ واپس ضرور آئے گا۔ اسے آنا ہی ہو گا کیونکہ وہ میرے بغیر رہ جو نہیں سکتا۔

کیونکہ میں اس کی لیبارٹری کے پنجرے میں بند وہ چوہا ہوں جس پر وہ تجربات کرنا چاہتا ہے۔

لیکن میں اسے ایسا کرنے دوں تب نا۔



کیا میں نے بتایا کہ مجھے بدلاؤ پسند نہیں؟

اچھانا۔ یوں آنکھیں کیوں گھما رہے ہو۔ یہ حصہ غور سے پڑھنا کیونکہ یہ اہم ہے۔

تمام شکاروں کے لیے میرا طریقہ واردات ایک تھا۔ جسے ہمدان modus operandi کہتا ہے۔

میں ہمارے معاشرے کے کمزور، بے بس اور لاچار لوگوں کا انتخاب کرتی ہوں کیونکہ مجھے ان پر ترس آتا ہے۔

کیا کہا؟ تمہیں یقین نہیں؟ مجھے بھی نہیں ہے۔

لیکن مجھے ان کے لیے بہت برا محسوس ہوتا ہے۔ اتنا برا کہ ایک دن میں نے سڑک کنارے کھڑی ایک بچی کو دیکھا تو اسے گھر لے آئی۔

اسے اچھے سے نہلایا دھلایا۔ نئے کپڑے پہنائے۔ اس کو تیار کیا۔

لیکن یہ سب میں نے بعد میں کیا۔

پہلے میں نے ایک ایک کر کے اس کی انگلیوں کے ناخنوں کو پلاس کی مدد سے علیحدہ کیا۔

کیوں؟ کیونکہ ان میں میل جما ہوا تھا۔ ایسے فضول کے سوال پوچھوں گے تو میں کہانی آگے نہیں بڑھاؤں گی۔

اچھا تو میں کہاں تھی؟

ہاں — میں نے اس کے ناخن الگ کیے۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو زپ ٹائی میں جکڑ کر رکھا تاکہ وہ زیادہ ہاتھا پائی نہ کرے۔

اس کے منہ میں میں نے کپڑا ٹھونس کر اوپر سے ٹیپ لگا دیا تھا تاکہ وہ اپنی زبان کو دانتوں تلے نہ چبا لے۔ اس طرح اسے چوٹ لگ جاتی اور مجھے تکلیف ہوتی۔

ہاں، ہاں میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ تو کیا ہوا؟ تم کونسا ہر بار سچ بولتے ہو؟ تمہیں پتہ ہے انسان ہی وہ واحد جاندار ہے جو جھوٹ بول سکتا ہے اور وہ بھی اس قدر صفائی اور ڈھٹائی سے۔

اگلی باری اس کے پیروں کے ناخنوں کی تھی۔ اس کی دائیں پیر کی آخری انگلی کا ناخن بہت چھوٹا تھا اس لیے اسے کھینچ کر نکالتے وقت اس کی پوری انگلی کچل گئی۔ لیکن میں نے بھی سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرش پر پہلے ہی پلاسٹک بچھا دیا تھا۔

میں اپنا کام بہت صفائی سے کرتی ہوں۔

اس پورے واقعہ کے دوران وہ بچی کیا کر رہی تھی؟ کیا وہ زندہ تھی؟

ظاہر سی بات ہے وہ زندہ تھی۔ مجھے مردہ اجسام پر تشدد کر کے مزہ نہیں آتا۔

میری بھی ایک ٹائپ ہے، آفٹر آل۔

وہ آنکھیں تکلیف اور وحشت سے پھیلائے، بار بار سر ہلا کر منہ سے مختلف آوازیں نکال رہی تھی۔ ہر بار جب میں پلاس اس کی انگلی پر رکھتی تو اس کا جسم تھر تھر کانپنے لگتا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر مجھے اپنی رگوں میں ایک تپش محسوس ہوئی تھی۔

اسے میں تھرل کہتی ہوں۔ اسی تھرل کے لیے ہی تو میں یہ سب کرتی ہوں۔

یہ ایک نشہ ہے۔ بلکہ بد ترین قسم کا نشہ۔ جب کوئی نشہ آور ڈرگ جسم میں داخل ہوتا ہے تو انسان کو جو خوشگوار کیفیت محسوس ہوتی ہے یہ اس سے کئی زیادہ طاقتور احساس ہوتا ہے۔

یہ ہیروئن کی طرح تمہارے دماغ کو ایک فرحت بخشتا ہے لیکن یہ دماغ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو صلب نہیں کرتا بلکہ اسے اور بڑھا دیتا ہے۔

اس سے جسم میں تکلیف محسوس کرنی کی حس کمزور ہو جاتی ہے۔ اسی لیے بھاری اوزار اٹھا کر اتنی مشقت کرنے کے باوجود مجھے درد محسوس نہیں ہوتا۔

البتہ اگلے دن بہت کچھ محسوس ہوتا ہے۔ پٹھوں کا درد، سر کا پھٹنا اور تھکن کا احساس۔ لیکن یہ چھوٹی سی قربانی تو دینی پڑے گی۔

وہ کہتے ہیں نا کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔

اس بچی کا نام سکینہ تھا۔ تم نے پوچھا نہیں مگر میں نے سوچا میں پھر بھی بتاتی چلوں۔

اس کی عمر ۷ سال کے قریب ہو گی۔ وہ اپنی ماں اور تین بہنوں کے ساتھ کسی ریلوے ٹریک کے قریب قائم جھونپڑی میں رہتی تھی۔

اس کی موت کے بعد میں نے اس کے میلے کچیلے کپڑے اس کی جھونپڑی کے آگے ڈال دیے تھے۔ اس کے گھر والوں کو حق حاصل تھا کہ انہیں اس کی موت کا پتہ چلے۔

میں نے اسے قتل کیسے کیا اور اس کی لاش کا میں نے کیا کیا؟

ہم بہت آگے بھاگ رہے ہیں۔ پہلے واپس میرے گھر کے اس بڑے باتھ روم میں چلتے ہیں جہاں سفید ٹائلوں والے فرش پر پلاسٹک بچھا ہے۔ جس پر اس وقت خون کے معمولی دھبے ہیں۔

اور سفید باتھ ٹب میں نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہے سکینہ۔ اس کا ننھا جسم تشدد کا پہلا مرحلہ تک برداشت نہ کر سکا۔

مجھے اس وقت بہت غصہ آیا تھا لیکن کوئی بات نہیں۔ کچھ دیر کا وقفہ لینے میں کوئی حرج نہیں۔

خون آلود پلاس اور اس کے میل جمے ناخنوں کو میں نے سنک میں رکھ دیا۔ ہاتھوں پر چڑھے سفید سرجیکل دستانوں کو نیچے موجود نلکے کے پانی سے کھنگال کر پاس موجود کوڑے دان میں ڈالا۔ پلاسٹک کے ایپرن کو دروازے کے پیچھے لگے ہک پر لٹکایا اور باتھ روم کی بتی بجھا کر میں ننگے پیر اپنے بیڈ روم میں آ گئی۔

میں جانتی تھی اس حالت میں سکینہ کہیں نہیں جا سکتی۔ اور اسے ڈھونڈنے کوئی نہیں آنے والا۔

اس کی ماں اور بہنوں کو اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ لوگ بہت سفاک تھے۔ انہیں سکینہ سے کوئی دلی لگاؤ نہیں تھا۔ بے فکر ہو کر میں بازار سے کھانے پینے کی اشیاء خرید نے چلی گئی۔

مارٹ میں مجھے ایک ماں اپنی بچی کو آئس کریم دلاتے نظر آئی اور میں نے بھی دو آئس کریم خرید لیں۔ بعد میں میں نے شاپنگ مال کا رخ کیا۔ جہاں سے میں نے بچیوں کے کپڑے، جیولری، جوتے اور کچھ اور چھوٹا موٹا سامان خریدا۔

جب تک میں گھر واپس پہنچی شام ہو چکی تھی۔ ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگز کچن کاؤنٹر پر دھرے۔ بیڈ روم سے ہوتے ہوئے میں نے باتھ روم کے دروازہ کے ناب پر ہاتھ رکھا۔

اندر سے سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سکینہ جاگ گئی تھی۔



ہر رات کی طرح اس رات بھی سسکیوں کی آوازیں مجھے سونے نہیں دے رہی تھیں۔ سر کو چادر میں ڈھانپ کر میں نے دوبارہ سونے کی سعی کی مگر کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میرا تجسس میری نیند پر غالب آگیا تھا۔

میں نے ماضی میں ایک آدھ دفع ان سسکیوں کا تعاقب کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں میں نے اکثر خود کو نچلی منزل کے گیسٹ روم کے دروازے کے سامنے کھڑا پایا۔

دروازہ ہمیشہ لاک ہوتا۔ اور تالے کی چابی بابا کے پاس۔

بابا نے مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ کبھی بھی اس گیسٹ روم میں قدم نہ رکھوں کیونکہ وہ آسیب زدہ تھا۔

بابا بہت احمق تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ میں بھوتوں کی کہانیاں سن کر ڈر جاؤنگی حالانکہ ہماری ٹیچر نے بتایا تھا کہ بھوت وغیرہ کچھ نہیں ہوتے۔ ہمیں ایسی چیزوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

"پھر ہمیں کن چیزوں سے ڈرنا چاہیے، مس لاریب ؟"
میں نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"انسانوں سے۔"

یہ انکا جواب تھا۔

بابا چابیوں کا گچھا اپنے بیڈ روم میں موجود دراز میں رکھتے تھے۔اس لیے آج گیسٹ روم کے دروازے کی طرف جانے کے بجائے میرے قدم خود بخود اوپری منزل کے ایک کونے میں واقع بیڈ روم کی جانب بڑھ گئے۔



میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔وہاں مکمل اندھیرا تھا۔میں نے آنکھیں بند کیں تاکہ فوراً روشنی ہونے سے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا نہ چھا جائے۔کیونکہ میں چاہتی تھی کہ مجھے اس روپ میں دیکھنے کے بعد سکینہ کے چہرے پر جو پہلا تاثر ہو،اس کی آنکھوں میں جو احساسات نمودار ہوں، میں انہیں ہمیشہ کے لیے اپنی یادداشت میں محفوظ کر لوں۔

ہاں میں نے اس پر تشدد کیا تھا اور اس وقت اس نے میرا وہ روپ دیکھا تھا۔ لیکن تم بھول رہے ہو کہ ہم نے بیچ میں ایک لمبا وقفہ لیا تھا۔

میں نے اسے ہاتھ پیر زپ ٹائی میں جکڑے ٹھنڈے باتھ ٹب میں انگلیوں پر موجود زخموں کے ساتھ ایک تاریک کمرے میں بے ہوشی کے عالم میں بند کیا تھا۔ اس دوران اس کے ننھے ذہن نے نا سمجھی، پریشانی، تکلیف، خوف اور ناامیدی کے مراحل بڑی تیزی سے پار کیے ہونگے۔ اور میں ان مراحل کے نشانات اس کی آنکھوں میں نقش دیکھنا چاہتی تھی۔

تمہیں سمجھانے کے لیے مجھے لمبی چوڑی تفصیلات پیش کرنی پڑ رہی ہیں۔

کیا کروں؟ کوئی میرے دماغ کو نہیں دیکھ سکتا نا۔ اس لیے میں خود تمہیں اپنے دماغ کی تہہ در تہہ گہرائیوں میں جھانکنے میں مدد کر رہی ہوں۔ شکریہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

جب میں نے بتی جلائی اور ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں آنکھیں کھولیں تو سکینہ ڈری سہمی میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کو روشنی کی عادت ڈلنے میں کچھ وقت لگا۔ اور اس جدوجہد کے دوران میں نے اس کی آنکھوں میں موت کے پہلے مرحلے کا عکس دیکھا۔

کنفیوژن۔

اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

ایک بار۔

دو بار۔

تین بار۔

اس کی بھنویں سکڑی۔

دوسرا مرحلہ۔

پریشانی۔

اور پھر وہ مجھے پہچان گئی۔

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ اور پھر پچھلے اوقات میں رونما ہونے والے واقعات اس کے ذہن کے پردے پر افشاں ہوئے۔

تیسرا مرحلہ۔

تکلیف اور پھر خوف۔

بھروسہ ٹوٹنے کا درد اور مستقبل کا اندیشہ۔

نا امیدی؟

نہیں۔ وہ ابھی نا امید نہیں تھی۔

اس میں ابھی وقت لگے گا۔

اس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں ابھی بھی زندگی کی رمق سے روشن تھیں۔

میں نے ہاتھ میں پکڑا شاپنگ بیگ ٹاول ریک پر رکھا۔

اس کے بعد میں نے سکینہ کو اس کی کمپرسی اور غربت سے نجات دلاتے ہوئے نہلایا۔ اس پر سے معاشرے کی وہ چھاپ مٹائی جو اسے اور باقیوں کو الگ کرتی ہے۔

میں نے اسے بہت اچھے سے نہلایا دھلایا تھا۔ البتہ تولیے سے اسے خشک کرتے ہوئے میں نے اس کے جسم پر کھروچوں کے نشانات دیکھے۔ ہو سکتا ہے میں نے ضرورت سے زیادہ طاقت کا استعمال کیا ہو لیکن وہ میل کچیل سے اٹی ہوئی تھی۔ اسے اچھے سے صاف کرنا ہی تھا۔

پھر میں نے اسے ہلکی گلابی رنگ کی گھٹنوں تک آتی فراک پہنائی۔ اس کے پیروں میں بند شوز پہنائے۔ اس کی پیروں کی انگلیاں سوج گئیں تھیں اور زخم نیلے پڑنے لگے تھے۔ اس لیے جوتے پہنانے میں مجھے کچھ دقّت کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک لمحے کو تو میں نے سوچا میں اس کے پیر کلہاڑی سے کاٹ کر چھوٹے کر دوں۔ لیکن پھر جوتے خون سے سن جاتے اس لیے میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اس کے بالوں میں کنگھی کر کے میں نے ایک گلابی ہیر بینڈ لگایا۔

وہ کوئی گڑیا معلوم ہوتی تھی۔

اگر وہ اپنے چہرے کے تاثرات درست کر لیتی تو اور بھی پیاری لگتی مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ جب میں نے اس سے مسکرانے کا کہا تب بھی اس نے میری بات نہیں مانی۔

اس کے گال پر ایک تھپڑ رسید کرنے کے باوجود وہ میری کسی بھی ہدایت پر عمل نہیں کر رہی تھی۔

میں نے اسے آئس کریم بھی پیش کی لیکن اس نے کھانے سے منع کر دیا۔ حالانکہ میرے ساتھ گھر آتے ہوئے اس نے مجھے راستے میں بتایا تھا کہ وہ آج آئس کریم کے لیے پیسے جمع کرنے اپنی جھونپڑی سے نکلی تھی۔

حیرت ہے۔ انسان خوف طاری ہو جانے کے بعد اپنی من پسند چیزوں کو کیسے بھول جاتا ہے؟ مجھے یہ بات کبھی سمجھ نہیں آ سکی۔ جبھی تو خوف میرے لیے ایک بہت پراسرار احساس ہے۔

میں نے اسے کھانے کے لیے پیز ادیا جو کہ باتھ ٹب کے مرمری کنارے پر ہی رکھا رہا۔

تم سوچ رہے ہو گے باتھ روم میں کوئی کیسے کچھ کھا سکتا ہے؟ تو میں بتاتی چلوں وہ باتھ روم میرے زیر استعمال نہیں تھا۔ حفظان صحت کے اصولوں سے میں بھی واقف ہوں۔ تمہیں کیا لگتا ہے میں انسان نہیں ہوں؟

ایک کرسی سنک کے ساتھ رکھے میں اس پر بیٹھ گئی اور نوڈلز کھانے لگی۔

یہ کوئی غیر ملکی کمپنی تھی جو سب سے مصالحے دار نوڈلز بنانے کا دعوی کر رہی تھی۔ آپس کی بات ہے نوڈلز میں کوئی اتنی مرچیں بھی نہیں تھیں۔ لوگوں نے بلا وجہ ہی اس برانڈ کو سر پر چڑھا رکھا تھا۔

میں نے سکینہ کو وہ نوڈلز نہیں دیے۔ وہ ایک بچی تھی اور بھلے ہی نوڈلز میرے لیے قابل برداشت تھے اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ایک کم سن بچی کے لیے بھی وہ برداشت کے قابل ہوں۔

کیا ہوا؟ تمہیں لگتا ہے مجھے اس کی فکر نہیں تھی؟

اگر مجھے اس کی فکر نہ ہوتی تو میں اسے اس کی گندی جھونپڑی سے اپنے خوبصورت گھر میں نہ لاتی۔ اس کو یوں صاف ستھرا کر کے، مہنگے کپڑے پہنا کر اس کے آگے کھانا نہ رکھتی۔

دوران تفتیش ایک افسر نے مجھ سے کہا تھا کہ میں محض خود کو دھوکہ دے رہی ہوں کہ مجھے اپنے شکاروں کی فکر تھی۔

لیکن وہ افسر مجھے نہیں جانتا۔ جس طرف تم بھی مجھے نہیں جانتے۔

شاید وہ میرے لیے ایک نازک لمحہ تھا۔ جب سکینہ نے کہا کہ اسے گھر جانا ہے۔

"گھر۔"

جو اس کے پاس تھا ہی نہیں۔

وہ کتنی احسان فراموش ثابت ہوئی تھی۔ میں نے اسے سب کچھ مہیا کیا مگر پھر بھی وہ اپنے ان میلے کچیلے خاندان والوں کے پاس واپس جانا چاہتی تھی۔

لیکن یہ میرا گھر تھا۔

میری شکار گاہ۔

یہاں وہی ہوتا ہے جو میں چاہتی ہوں۔

اور وہاں اس رات وہی ہوا جو میں نے چاہا تھا۔

یہ میرا کھیل ہے۔

اس کے اصول بھی میں نے بنائے ہیں۔

وہ میرا شکار تھی۔

اور میں اُس کی۔۔۔ شکاری۔



اس وقت میں نچلی منزل کی راہداری میں کھڑی تھی۔ یہاں مکمل اندھیرا تھا اور میں بتی جلانے کا رسک نہیں مول لے سکتی تھی۔

میرا دل ایک انجانے احساس کے تحت بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے میرے تجسس میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

چابی گیسٹ روم کے کی ہول میں گھمانے پر ایک کلک کی آواز پیدا ہوئی۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ اب بابا کا وہ راز راز نہیں رہے گا۔

دروازہ دھکیلتے میں دبے پیر چلتی اندر داخل ہوگئی۔ کمرہ تاریکی میں ڈوبا تھا مگر میں نے ہاتھ سے دیوار ٹٹولتے ہوئے سوئچ بورڈ تلاش کر کر لائٹ جلادی۔

ایک جھٹکے سے کمرہ روشن ہوگیا۔ وہ آج بھی ویسا ہی تھا جیسا میں نے کچھ سال قبل اسے دیکھا تھا۔

ہلکے براون رنگ کی دیواریں، سرخ قالین، گہری براون رنگت کے پردے اور معمولی سافرنیچر جس میں لکڑی کا پلنگ، دو چھوٹی سائیڈ ٹیبل، ایک الماری اور سنگھار میز شامل تھا۔

گیسٹ روم آخری مرتبہ کب استعمال ہوا تھا؟ مجھے یاد نہیں۔ ماما کی موت کے بعد سے ہمارے گھر کبھی کوئی مہمان نہیں آیا۔

لیکن فرنیچر پر جمی ہلکی مٹی کی تہہ سے ظاہر تھا بابا اس کمرے کی صفائی کبھی کبھار کرتے رہتے تھے۔ شاید تب جس وقت میں اسکول گئی ہوتی تھی۔

وہ سسکیاں دروازے کے کھلنے پر بند ہوگئی تھیں۔ لیکن کمرہ ویران تھا۔

بیڈ کی چادر پر کوئی سلوٹیں نہیں تھیں۔ سنگھار میز سنگھار کے سامان سے عاری تھا۔ یہ کمرہ استعمال میں نہیں تھا۔ تو پھر وہ آوازیں یہاں سے کیسے آ رہی تھیں؟

میں نے الماری کے پٹ کھول کر دیکھا۔ اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے پلنگ کے نیچے بھی جھانکا، وہاں بھی کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔

"کوئی ہے؟"

کوئی جواب نہیں آیا۔

بھوتوں پر مجھے یقین نہیں تھا اور کوئی انسان یہاں موجود نہیں تھا۔

ایک سانس خارج کرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر سے کمرے پر ایک سرسری نظر ڈالی۔

ہو سکتا ہے آواز کمرے کی پچھلی جانب موجود پلاٹ سے آ رہی ہو؟ وہ جگہ ایک عرصے سے خالی پڑی تھی۔

میں واپس جانے کے لیے مڑی۔ مگر میرے پیر اپنی جگہ جم گئے۔

میں نے بجلی کی سی تیزی سے پلٹ کر سامنے کی دیوار کی جانب دیکھا۔

وہاں پردے ایک قطار کی مانند لٹکے تھے۔ میں فوراً ان کے قریب پہنچی اور پردے ایک طرف کھسکائے۔

اور یہاں موجود تھا وہ دروازہ جو اس سے پہلے پردوں کے پیچھے اوجھل تھا۔

لکڑی کا بنا بھاری دروازہ۔ جس کا ہینڈل سنہرے رنگ کا تھا۔

میں نے ہینڈل گھمایا مگر وہ لاک تھا۔ کی ہول سے اندر جھانکنے پر اندھیرا تھا۔

میں نے چابیوں کے گچھے میں سے ہر چابی استعمال کی لیکن وہاں اس دروازے کی چابی نہیں تھی۔

اب سمجھ آیا بابا نے چابیوں کا یہ گچھا میری پہنچ میں کیوں رکھا تھا۔ اب سمجھ آیا کہ مجھے اس تک رسائی کیسے ممکن ہوئی۔

میرے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ بابا میرے ساتھ کھیل کھیل رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میرا تجسس مجھے کہیں بھی لے جاسکتا ہے۔ اس دروازے کے پار بھی۔ اس چوکھٹ سے آگے بھی۔



میں نے بتایا کہ وہ ایک نازک لمحہ تھا۔ ورنہ کیا ہر کسی کے باتھ روم میں سلیج ہیمر یوں ہی پڑا ہوتا ہے؟ نہیں نا۔

اور میں اسے وہاں ارادتاً تو بلکل بھی نہیں رکھا تھا۔

میں سچ کہہ رہی ہوں۔

سچ سے یاد آیا میں نے سکینہ سے کہا تھا کہ میں اسے واپس اس کی اس پسماندہ جھونپڑی لے جاوں گی۔

جو کہ جھوٹ تھا۔

ویسے میں نے پہلے نہیں بتایا لیکن میں اسے چمبیلی کے پھول دکھانے کے بہانے اپنے گھر لے کر آئی تھی۔ اس نے میرے لان میں موجود چمبیلی کے پھول دیکھ کر انہیں اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش بھی ظاہر کی تھی۔

ہاں تو سلیج ہیمر۔

اس رات کے بعد سے وہ میرا پسندیدہ ہتھیار بن گیا تھا۔

تمہاری معلومات کے لیے بتادوں کہ سلیج ہیمر چٹان بھی توڑ سکتا ہے۔ لیکن اگر تم اسے پوری قوت سے استعمال کرو تو۔

ایک شکاری کو اپنے ہتھیار پر پورا بھروسہ ہوتا ہے۔ اور وہ شکاری ہی کیا جو ہتھیار ٹھیک سے استعمال نہ کر سکے؟

انسان کی ہڈیاں توڑنا کوئی اتنا مشکل عمل نہیں ہے۔ خاص طور پر جب ہڈیاں کسی کم سن بچی کی ہوں۔

میں نے پہلا وار اس کے سر پر کیا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر زیادہ قوت استعمال نہیں کی تھی۔ میں اسے اگلے پندرہ بیس منٹ تک زندہ رکھنا چاہتی تھی۔

اور ابھی میں نے بتایا کہ اس رات سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا میں نے چاہا تھا۔

ایک وار اور وہ باتھ ٹب میں بے مجال گری ہوئی تھی۔ اس کے سر کا ایک حصہ اندر کی جانب پچک گیا تھا۔ اور میں تمہیں بتا رہی ہوں جب سلیج ہیمر اس کی کھوپڑی سے ٹکرایا تھا تو ایک زبردست آواز پیدا ہوئی تھی۔

جیسے بسکٹ کو دو ٹکڑوں میں توڑتے ہیں۔ یا کوئی چپس دانتوں تلے چباتے ہیں۔

وہ تسکین آمیز آواز۔ اگر میرے پاس اچھی کوالٹی کا مائک ہوتا تو میں اس آواز کو ASMR کے طور پر ریکارڈ کر لیتی۔

اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا۔ اور اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ میں اسے تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔

اب میں نے بڑے آرام سے اس کے جسم کے مختلف جوڑ توڑے۔

ہر وار کے ساتھ پٹھے پھٹنے، گوشت پچکنے اور ہڈی کے ٹکڑے ہونے کی آواز مجھے تھرل دے رہی تھی۔

میں نے ۳۴ وار کئے تھے۔ ہاں میں گن رہی تھی۔ سچ کہوں تو چھٹے حملے کے بعد میں گنتی بھول گئی تھی مگر پولیس کی رپورٹ کے مطابق میں نے اس پر ۳۴ ہی وار کیے تھے۔ جس کے نتیجے میں اس کے جسم کی زیادہ تر ہڈیاں اور جوڑ یا تو ٹوٹ چکے تھے یا اپنی جگہ سے ہل گئے تھے۔ میں بتا سکتی تھی کیونکہ کوئی بھی انسان پیر میں تین نوکیلی باہر کو نکلتی جلد لے کر پیدا نہیں ہوتا۔

میں نے ہاتھ روک دیا۔ میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ سیاہ بال بکھر کر میری آنکھوں کے آگے آگئے تھے۔ کسی بلا کی مانند۔

اب وہ ایک ڈھیر کی طرح لگ رہی تھی۔ ہلکی گلابی فراک خون سے تر تھی۔ اس کے بال اس کے سر سے چپکے ہوئے تھے۔ اس کی ایک آنکھ پھٹ کر بہہ رہی تھی۔ اور ہاں بہنے سے یاد آیا اس کا مغز اس کے کانوں سے باہر نکل رہا تھا۔ یہ میری زندگی کا سب سے دلچسپ نظارہ تھا۔

باتھ ٹب تیزی سے خون سے بھر رہا تھا۔ میں نے ڈرین کو ہٹا کر نلکا کھول دیا۔ پانی خون کو ساتھ لیتا نالی میں جانے لگا۔

خون جو گاڑھا ہوتا ہے۔

اور گرم بھی۔

باتھ روم میں حبس بڑھنے لگا تھا۔ میں خون اور پسینے سے شرابور تھی۔

مجھے شدید قسم کی پیاس لگی تھی۔ میں نے سنک کے نل سے پانی پی کر سرجیکل دستانے کھنگالے۔ انہیں کوڑے دان میں ڈالتے ہوئے میں نے ایپرن سنک میں پھینکا۔

اس دوران پانی بہتا رہا اور اپنے ساتھ میرے جرم کے ثبوت بھی دھوتا رہا۔

میں نے باتھ روم صاف کیا۔ خود بھی شاور لے کر فریش ہو گئی۔

باتھ روم کیسے اور کن چیزوں کی مدد سے صاف کیا وہ میں تمہیں بتا کر وقت ضائع نہیں کروں گی۔ تم گوگل کر سکتے ہو لیکن دھیان رہے آخر میں "for writing purposes" ٹائپ کرنا مت بھولنا۔

جب میں باتھ روم میں واپس آئی تو سکینہ کافی صاف ستھری نظر آ رہی تھی۔ یا پھر میں کہوں کہ اس کی لاش۔



آج بھی سسکیوں کی آوازیں بدستور آرہی تھیں۔اور یہی میرا اشارہ تھا کہ چابی کی تلاش شروع کر دینی چاہیے۔

بابا دوپہر کے وقت کسی سیمینار میں شرکت کی وجہ سے باہر گئے تھےاور ان واپسی شام کو ہونی تھی۔

یہی میرا موقع تھا۔

بابا چابی اپنے ساتھ لے کر گئے ہونگے مگر ہو سکتا ہے چابی یہاں بھی ہو۔اصل نہیں تو نقل۔

دو گھنٹے گھر کا ایک ایک کونا چھان مارنے کے باوجود میرے ہاتھ کچھ نہیں لگا۔اب میں پسینے میں شرابور کچن میں کھڑی پانی کا گلاس ہاتھ میں تھامے سوچ رہی تھی کہ وہ چابی آخر کہاں ہو گی؟

پھر میرے قدم بابا کی اسٹڈی کی جانب اٹھ گئے۔دروازہ کھول کر میں اندر چلی گئی۔میں نے یہاں کی تلاشی لی تھی۔میز کی درازیں،کتابوں کے اوپر،الماری کے اندر۔ہر جگہ۔

اب میری نظر اس قوی ہیکل شیلف پر پڑی۔ جس میں انسانی نفسیات اور مختلف دماغی عارضے کے موضوعات پر مبنی کتابیں ایک قرینے سے رکھی تھیں۔

یہ شیلف ہمیشہ سے ہی اسٹڈی کا حصہ تھا۔ مجھے یا ماما کو اسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ میرے بابا کو کتابوں سے عشق تھا۔ کم از کم اس وقت تو مجھے ایسا ہی لگتا تھا۔

شیلف کی لمبائی چھ فٹ تھی۔

اگر کسی بچے سے کوئی چیز اس کی پہنچ سے دور رکھنی ہو تو کہاں رکھتے ہیں؟

جب میں بسکٹ کا جار چرانے سے باز نہیں آتی تو بابا جار کو کچن کیبنٹ کے اوپر رکھ دیتے۔ اس طرح کاؤنٹر پر چڑھ کر بھی میرا ہاتھ جار تک نہ پہنچ پاتا۔

میں نے کھڑکی کے پاس موجود کرسی گھسیٹتے ہوئے شیلف کے سامنے رکھ دی۔ اور اس پر چڑھ کر ہاتھوں سے شیلف کی سطح کو چھونے کی کوشش کی۔

میری انگلیاں بمشکل کنارے کو چھو پا رہی تھیں۔ میں وہاں سے اتری اور بابا کی ریڈنگ ٹیبل سے موٹی موٹی کتابیں اٹھا کر کرسی پر رکھنے لگی۔

تم سمجھ سکتے ہو کہ مجھے بچپن ہی سے کتابوں کا شوق نہیں تھا۔ ورنہ میں وہ نہ کرتی جو میں نے آگے چل کر کیا۔

میں نے تقریباً تین کتابیں اوپر تلے کرسی پر رکھی تھیں۔ ان پر چڑھ کر اب میرا قد اتنا اونچا ہو گیا تھا کہ مجھے شیلف کی اوپری سطح تک پہنچنے میں کوئی دقّت پیش نہیں آئی۔

وہاں بہت مٹی تھی، میں نے انگلیاں دائیں بائیں کیں۔ مکڑی کے جالے اور لکڑی کے زرات میری انگلیوں پر لگ گئے۔

میں پیروں کی انگلیوں پر اور اونچا اٹھی۔ ہاتھ مزید آگے کی جانب بڑھایا اور پھر میری انگلیاں کسی ٹھوس چیز سے ٹکرائیں۔

دھاتی چیز سے۔

میں نے جھٹ سے اسے اپنی جانب کھینچا اور ایک چابی قالین پر معمولی آواز سے گر گئی۔

میں کامیاب ہو گئی تھی۔ تم اسے میری خوش قسمتی سمجھو یا ان لوگوں کی بد قسمتی جن کی موت میرے ہاتھوں ہونا قرار پائی تھی، اس شام مجھے محض گیسٹ روم کے مقفل باتھ روم کے دروازے کی کنجی ہاتھ نہیں لگی تھی بلکہ یہ میری حقیقت بدلنے کی کنجی تھی۔ وہ چابی مجھے زندگی کا ایک ایسا انکشاف کروا گئی جو کہ میں کبھی فراموش نہ کر سکی۔



میں نے نلکا آدھے گھنٹے پہلے بند کر دیا تھا۔ اب ٹب میں تھوڑا خون اور پانی جمع تھا۔

تمہیں پتہ ہے مجھے تین بار باتھ ٹب کے ڈرین کو ٹوتھ برش کی مدد سے صاف کرنا پڑا۔ کیونکہ ہر بار یا تو خون کے لوتھڑے، بال یا پھر اس کا برین میٹر نالی بند کر دیتا۔

پیزا ابھی بھی ٹاول ریک پر موجود تھا جسے میں نے صاف صفائی کے وقت وہاں رکھ دیا تھا۔ڈبے پر خون کے دھبے تھے مگر اندر سے وہ ابھی بھی کھانے لائق تھا۔

میں نے اسے مائیکرو ویو کر کے کھایا تو مجھے اس سے سکینہ کی خوشبو آئی تھی۔

رات بہت ہو چکی تھی اس لیے میں آرام کرنے اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ بستر پر لیٹے مجھے ابھی بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں نے کیا کیا تھا۔

میرا باتھ روم دوسری منزل پر واقع ہے اور اس کی پشت پر دھوپ کی کرنیں پڑتی ہیں۔ اس لیے وہاں کا درجہ حرارت گرم رہتا تھا۔ وینٹی لیشن کا کوئی خاص انتظام میں نے جان بوجھ کر نہیں کروایا تھا۔اس لیے دو دن میں لاش گلنے سڑنے کے آخری مراحل میں پہنچ چکی تھی۔

لاش کی بُو کیسی ہوتی ہے؟

جب میں نے باتھ روم کا دروازہ کھولا تو جو بُو میرے نتھوں سے ٹکرائی وہ ویسی ہی تھی جیسے کسی چوہے کے مر کر سڑنے پر پیدا ہوتی ہے مگر اس سے کئی گناہ زیادہ۔ جیسے سینکڑوں چوہے ایک ساتھ مر کر گل رہے ہوں۔ وہ ایسی بدبو ہوتی ہے جسے سونگھ کر جو پہلا خیال تمہارے ذہن میں آئے گا وہ۔

"یہ بدبو کسی کی لاش کی ہے۔"

یہ ہوگا۔

ویسی بدبو دنیا میں کسی اور چیز یا جاندار سے نہیں آسکتی۔ مجھے بہتر پتا ہے کیونکہ میں نے پرندے، کیڑے مکوڑے اور جانورں پر بہت سے تجربات کیے تھے۔

اور سب سے دلچسپ بات بتاؤں تمہیں؟

وہ بُو ہفتوں تک اس جگہ سے نہیں جاتی۔ وہ وہاں رچ بس جاتی ہے۔ اور تو اور محلے والے بھی اسے محسوس کر لیتے ہیں۔ مجھے تو مجبوراً ایک کبوتر مار کر انہیں دکھانا پڑا کہ بدبو اس کی لاش سڑنے سے آرہی ہے۔

سکینہ کی لاش کا میں نے کیا کیا؟ فکرمت کرو میں نے اسے کھایا نہیں۔ میں کوئی آدم خور نہیں ہوں۔

تم ہر بار میرے حوالے سے ایسی فضولیات کیوں سوچتے ہو؟ کیا میں تمہیں ایسی لگتی ہوں؟

میں نے کلہاڑی کی مدد سے اس کے ٹکڑے کیے اور پھر انہیں سیاہ پلاسٹک کے چھوٹی چھوٹی تھیلوں میں باندھ دیا۔

ایک لاش کو ٹھکانے لگانا سب سے بوریت اور محنت والا عمل ہے۔ کم از کم میرے لیے تو تھا۔

سر کو دھڑ سے جدا کرنا اور بھی پیچیدہ۔ مجھے کلہاڑی کے ساتھ ساتھ آری کا استعمال بھی کرنا پڑا تھا۔

اب وہ کہاں ہے؟

سکینہ کو میری کیاری میں لگے چمبیلی کے پھول پسند آئے تھے۔ اس لیے اب وہ ان کے لیے فرٹیلائزر کا کام کر رہی تھی۔ میرے پھول بہت پھلے پھولے تھے اس کے بعد۔ حیرت ہے ہم نے انسانی باقیات کو فرٹیلائزر کے طور پر استعمال کرنا بڑے پیمانے پہ شروع کیوں نہیں کیا؟

میں نے اس کے میلے کپڑے جب اس کی جھونپڑی کے باہر رکھے تھے تو ساتھ میں ایک چمبیلی کا پھول بھی رکھا تھا۔ اس نے کہا تھا وہ اپنی ماں کو وہ پھول دینا چاہتی ہے۔

وہ پھول سکینہ کی آخری آرام گاہ پر اگا تھا۔ اس لیے مجھے لگا اس پر اس کے خاندان والوں کا زیادہ حق تھا۔

خیر بعد میں پولیس نے ان تمام پھولوں کو روند دیا تھا۔ ہڈیاں ڈھونڈنے کے لیے۔ جو کہ انہیں مل بھی گئی تھیں۔

میرا شکار اکیلی سکینہ نہیں تھی بلکہ مزید ۱۱۱ افراد اور بھی میرے ہتھے چڑھے تھے۔ جن کے بارے میں پولیس کو معلوم ہے۔ جن کے مقدمات مجھ پر درج ہیں۔ جن کے قتل کے جرم میں مجھے عمر قید کی سزا سنائی گئی۔

لیکن کیا میرے شکاروں کی کل تعداد ۱۲ ہی تھی؟

اس سوال کا جواب تم خود سوچو۔

میری ایک ٹائپ ہے۔ میں کسی مخصوص جنس یا عمر کے شخص کو نشانہ نہیں بناتی۔

یہی میری ٹائپ ہے اور اسی وجہ سے میں ۴ سال پولیس کی ناک کے نیچے قتل پہ قتل کیے جا رہی تھی اور انہیں مجھ پر شک تک نہ ہوا۔

پھر میں پکڑی کیسے گئی؟

کیونکہ ایک دن میں نے ٹی وی پر ایک سائیکولوجسٹ کا انٹرویو دیکھا جو مجھ سے بات چیت کرنے کے خواہ تھے۔ وہ میرے اوپر ریسرچ کرنا چاہتے تھے۔

اس سائیکولوجسٹ کو میں نے اپنی یونیورسٹی میں ایک بار لیکچر دیتے سنا تھا جس میں وہ سائیکو پیتھی اور نیچر ورسز نرچر پر بحث کر رہے تھے۔

آیا سائیکوپیتھ پیدائشی ایسے ہوتے ہیں یا ہمارا ماحول اور معاشرہ انہیں ایسا بناتا ہے۔

دنیا کی فقط ایک فیصد آبادی سائیکوپیتھ ہے۔ لیکن ہر سائیکو پیتھ سیریل کلر نہیں ہوتا۔ مگر ہر سیریل کلر کسی نہ کسی حد تک سائیکوپیتھ ہوتا ہے۔

سائیکولوجسٹ کو میرے بارے میں پتہ کیسے چلا؟

میرے صحن کی کیاری چھوٹی تھی اور میں ہر چار مہینے بعد کھدائی کا کام نہیں کر سکتی تھی۔

سو میں نے لاشوں کو شہر میں پھینکنا شروع کر دیا۔ میڈیا نے مجھے ''دی سلیج ہیمر کلر'' کا خطاب دیا۔ وہ لوگ مسلسل مجھے کوئی آدمی سمجھتے رہے۔

لیکن جب سائیکولوجسٹ نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔

اور بس۔ پھر میں نے گرفتاری دے دی۔

مجھے سزائے موت نہیں دی گئی۔ اور اس لیے بھی کہ میں ایک لڑکی تھی۔

اس ملک میں خواتین اور انسانی حقوق کی پاسداری کے لیے چلنے والی تنظیموں نے مجھے پھانسی لگنے سے بچایا۔ پارلیمنٹ میں قرارداد منظور ہوئی اور آج میں عمر قید کی سزا کاٹ رہی ہوں۔

اس دنیا کا قانون محض ایک مزاق ہے۔ یہاں مجھ جیسوں کے انسانی حقوق ہیں کیونکہ میں ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتی ہوں۔ لیکن ان لوگوں کے نہیں جو غربت، بھوک افلاس میں زندگی گزارتے ہیں۔

لیکن اس سے زیادہ غصہ دلانے والی بات یہ ہے کہ انہیں لگتا ہے یہ لوگ میری زندگی اور موت کا اختیار رکھتے ہیں۔

اس لیے میں یہاں قید رہتے ہوئے بھی وقتاً فوقتاً انہیں باور کرواتی رہتی ہوں کہ میں اپنے فیصلے خود کرتی ہوں۔

چاہے اپنے باتھ روم میں کیے جانے والا پہلا انسانی قتل ہو یا اس چار دیواری میں کیا جانے والا تشدد۔

میری شکار گاہ میں صرف میرا قانون چلتا ہے۔

یہاں کی داروغہ میں ہوں۔

یہ لوگ میرے شکار ہیں۔

اور میں اِن کی شکاری۔



اس شام میں نے گیسٹ روم میں موجود باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ اور وہ پہلی بار تھا جو میں نے زندگی میں وہ چوکھٹ پار کی تھی۔ میں نے اس دوسری دنیا کا چہرہ دیکھا جس کے بارے میں میں نے بس آج تک صرف لوگوں کو سرگوشیاں کرتے سنا تھا۔

میں نے تاریکی میں جھانکنے کی جرأت کی تھی۔ اور بدلے میں تاریکی نے بھی مجھے پلٹ کر دیکھا تھا۔

اس شام پہلی بار میری اس احساس سے شناسائی ہوئی جسے عام الفاظ میں خوف کہتے ہیں۔

قبر سے بھی گہرا اندھیرا تھا وہاں۔ موت سے بھی زیادہ خاموشی۔ سسکیوں کی آوازیں گیسٹ روم کی دہلیز پار کرتے ہی رک گئی تھیں۔

میں نے دیوار پہ لگے سوئچ بورڈ کا بٹن دبایا اور باتھ روم روشنی میں نہا گیا۔

باتھ روم بلکل صاف ستھرا تھا۔ شاید مجھے بھی صفائی کی عادت اپنے بابا سے ورثے میں ملی تھی۔

لیکن وہاں سفید ٹائلوں والے فرش پر ایک وجود بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ ہتھکڑی اور زنجیر کی مدد سے پاس موجود نلکے سے بندھے تھے۔ اس کے پیروں میں بھی ایک رسی نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

اس عورت کا چہرہ زخموں سے چور تھا۔ اس کے بازو اور کلائی پر سگریٹ سے جلائے جانے کے نشانات تھے۔ اس وقت اس کے منہ پر ٹیپ لگا تھا اور گال کا ایک حصہ نیلا پڑ چکا تھا۔

عورت کے لباس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی اس کی نیم وا آنکھوں میں خوف کی جھلک اتری۔ مگر دھیرے دھیرے وہ خوف امید میں بدل گیا۔ شاید اسے لگا تھا کہ ایک بچی اس کی یہاں سے نکلنے میں مدد کرے گی۔

اس نے تیزی سے اپنا چہرہ دائیں بائیں ہلا کر کچھ کہا، مگر اس کے منہ پر ٹیپ لگے ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔

اس کی حالت اس وقت ایک پنجرے میں بند پرندے کی مانند تھی۔ جو پھڑ پھڑاتے ہوئے کسی کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانا چاہتا ہو۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو سینے تک اٹھایا جس سے فرش پر پڑی زنجیر میں حرکت ہوئی اور ایک جھٹکے سے وہ ہوا میں معلق ہو گئی۔

شاید وہ چاہتی تھی کہ میں اس کی زنجیر کھولوں۔ لیکن میں ایسا کیوں کرتی؟

باباکی خلاف ورزی میں پہلے ہی کر چکی تھی۔اب ان کے اس مہمان کو یہاں سے بھگا کر میں ان کے عتاب کا شکار کیونکر بنتی؟

اس عورت کو وہیں روتے، بلکتے چھوڑ کر میں باتھ روم سے باہر نکل گئی۔

واپس تالا لگا کر میں نے چابی شیلف کے اوپر رکھ دی۔البتہ باتھ روم کی لائٹ بجھانا میں بھول گئی تھی۔سچ مچ۔

میں اپنے کمرے میں آگئی۔آدھا گھنٹہ گزرا تھا کہ بابا بھی گھر آگئے۔اس رات سسکیوں کی آوازیں نہیں آئیں۔

دوسرے دن بابا اپنی گاڑی میں کہیں گئے۔میں جانتی تھی انہوں نے ڈکی میں کیا رکھا تھا۔میں انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہی۔وہ اپنا جرم اپنے ساتھ لیے جا رہے تھے۔

میں نے ویسا خوف اور ویسی وحشت کسی کی آنکھوں میں دوبارہ کبھی نہیں دیکھی۔ لیکن میں شدت سے وہ خوف دوبارہ کسی کی آنکھوں میں دیکھنے کے لیے بے چین تھی۔

میرے بابا ایک سیریل کلر تھے اور باقی سیریل کلرز کی طرح وہ بھی قتل کرنے سے خود کو روک نہیں سکتے تھے۔ سیریل کلرز قتل کرنا صرف چند ہی صورتوں میں روکتے ہیں۔ یا تو وہ کسی جرم کے سلسلے میں جیل چلے جائیں، وہ خودکشی کر لیں یا پھر ان کی موت واقع ہو جائے۔

بابا کے ساتھ زندگی نے دغا کیا۔ وہ ایک کار حادثے میں جاں بحق ہو گئے اور ان کا راز محض راز ہی رہ گیا۔

مگر میں ان کی میراث کو ایسے کیسے جانے دیتی؟

میں نے خود کو روکا۔ بہت سمجھایا۔ شروع میں میں نے جانوروں اور پرندوں پر اپنے تجسس کو آزمایا۔ وقت گزرتا رہا لیکن میرے اندر ایک کسک تھی۔ ایک پیاس۔

ایک عرصے تک میں نے خود پر قابو رکھا۔ شاید ایسا کرنا اس لیے بھی آسان تھا کیونکہ میں نے ابھی تک انسانی خون کے چھینٹے اپنی جلد پر محسوس نہیں کی تھیں۔

لیکن سکینہ نے سب کچھ بدل دیا۔ اور مجھے یہ بدلاؤ حیر تناک ہونے کے باوجود پسند آیا۔

میں کبھی کبھار سوچتی ہوں کہ اس شام گیسٹ روم کے باتھ روم کی بتی نہ بجھا کر میں نے صحیح فیصلہ کیا تھا یا غلط؟ مگر پھر اپنے باتھ روم کے فرش پر تڑپتے شکار کی آنکھوں میں موجود خوف کو دیکھ کر مجھے ہر بار اپنا فیصلہ سو فیصد درست معلوم ہوتا ہے۔

ہر سائیکوپیتھ سیریل کلر نہیں بنتا۔ لیکن میں یہاں سائیکوپیتھ لوگوں کی ترجمانی کرنے نہیں آئی ہوں۔ میں یہاں تمہیں اپنی کہانی سنانے آئی ہوں۔ وہ کہانی جس کے فیصلے میں نے خود کیے۔ میں اپنے کیے کا الزام کسی دماغی عارضے، معاشرے کی بدسلوکی یا اپنے باپ کے گناہوں کو نہیں ٹھہراتی۔

مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں اپنے اندر موجود اس حیوان کو پہچانوں اور قبول کروں۔ میں جو کرتی ہوں، جو میں نے کیا ہے اور آگے جو کچھ بھی کروں گی۔ وہ سب میری اپنی مرضی پر منحصر کرتا ہے۔

مجھ جیسے لوگ بھی اس دنیا میں ہوتے ہیں، تمہارا کوئی پڑوسی، وہ معصوم سا دکھنے والا اسٹور کلرک، تمہاری بس کا وہ ڈرائیور جو تمہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا ہے یا پھر تمہارا کوئی رشتہ دار۔

وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔

حیوان تو کئی روپ دھار کر پھرتے ہیں۔ تمہیں یقین نہیں آتا؟خوف محسوس ہوتا ہے؟انسان کے متعلق کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ تم کب، کہاں، کس کا شکار ہو جاو۔ کوئی نہیں جانتا۔ تم بھی نہیں۔ اور مزے کی بات ہے کہ تمہارا شکاری بھی یہ بات نہیں جانتا کہ وہ کب، کہاں، کس کا شکار کرے گا۔



آج میں پھر اسی کمرے میں موجود تھی۔ اور وہ میرے سامنے براجمان تھا۔

لیکن آج اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک نہیں آئی۔ بلکہ مجھے غصہ تھا۔ مجھے اس سے گھِن محسوس ہو رہی تھی۔

وہ مجھ سے دو ہفتے بعد ملنے آیا ہے۔ ان تین مہینوں میں اس نے ایک بھی ہفتے ناغہ نہیں کیا تھا۔

اسے لگتا ہے وہ مجھ سے اپنے چہرے کے دمکتے رنگ کو چھپا سکتا ہے۔ ویسے ہی جسے اس نے کچھ دیر پہلے اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی اسکرین کو مجھ سے چھپا کر پڑھا پھر جلدی سے اسے اپنی پتلون کی جیب میں اڑس دیا۔

یا شاید ویسے ہی جیسے اس نے یہاں آنے سے پہلے اپنی انگلی میں پہنا چاندی کا چھلا اتار کر کہیں چھپا دیا تھا۔ اب بس اس کی نرم اور باریک انگلی میں ایک انگوٹھی کا نشان تھا۔

ایک ہالہ۔

ایک وعدے کا نشان۔

جو کہ اب وعدہ خلافی کا ثبوت تھا۔

کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کا ایک تازہ جھونکا اندر آیا۔ باہر آسمان پر سیاہ بادلوں کے ڈیرے تھے۔ کچھ ہی پل میں بادل اپنے سینوں پر اٹھائے بوجھ کو ہلکا کرنے والے تھے۔

"آج میں میرے آخری شکار کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ جس کے بارے میں جاننے کا تمہیں بہت اشتیاق ہے۔"

میں نے لہجے کی کڑواہٹ کو نگل لیا تھا۔

وہ موٹی چھوٹی اہلکار آج بھی سلاخدار دروازے کی دوسری جانب کھڑی تھی۔ اس نے چوکھٹ پار نہیں کی تھی۔

کیونکہ چوکھٹ صرف ہمدان پار کر کے میرے پاس آتا تھا۔

میری بات سن کر اس کے پورے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

اس نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبانے کے بعد مجھے اشارہ کیا۔

"بولو۔"

"میرے آخری شکار کو میں مارنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ ہم ایک جیسے ہیں۔ لیکن اس نے میرے بھروسے کو ٹھیس پہنچائی تھی۔"

میں دھیمی آواز میں گویا ہوئی۔



ایک مہینے پہلے میں نے ٹی وی پر نیوز دیکھی کہ کسی لڑکی کی لاش ایک میدانی علاقے سے ملی ہے۔ اس کے جسم کی ساری ہڈیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ آلہ قتل کوئی کند سطح والی چیز تھی۔ فرانزک ڈاکٹر کے مطابق اسے 90% یقین تھا کہ ہتھیار کوئی سلیج ہیمر تھا۔

لڑکی کی شناخت ایک ملازمہ کے طور پر ہوئی تھی جو آس پاس کے علاقے میں موجود بنگلوں میں کام کرتی تھی۔

بعد میں مجھے قیدی 378 نے بتایا تھا کہ اس نے وارڈن کو کہتے سنا تھا کہ لڑکی کو زیادتی کا نشانہ نہیں بنایا گیا تھا لیکن اس کے کپڑے تبدیل کر دیے گئے تھے۔

یہ میرا modus operandi تھا۔

کوئی میرے شکار کے طریقے کی نقل کر رہا تھا۔

ایک کاپی کیٹ کلر۔

اس ملک میں یہی تو مسئلہ ہے۔ اصل ابھی مشہور نہیں ہوا اور نقل پہلے آ گئی۔

لیکن بات اتنی سیدھی نہیں تھی۔ میرے کیس کی تفصیلات مخفی رکھی گئی تھیں تا کہ کوئی کاپی کیٹ کلر جنم نہ لے لے۔

لیکن پھر بھی کوئی میری نقل اتار رہا تھا۔ اور ایسا صرف ایک ہی انسان کر سکتا تھا۔



قیدی 326، جسے میں نے آئی سی یو پہنچایا تھا جو کہ اب کوما میں تھی اور عنقریب مرنے والی تھی۔ وہ جیل میں اپنی پہنچ کے لیے جانی جاتی تھی۔ نشہ آور اشیاء ہو یا کوئی اور غیر قانونی سامان۔ اچھی ڈیل دو تو وہ اسمگل کر لیتی تھی۔

اس نے مجھ سے کہا تھا اگر باقی قیدیوں سے اسے تحفظ فراہم کروں تو وہ میرا ایک کام کرے گی۔ ایک مہینہ اس کا سائے کی طرح ساتھ دینے پر اس نے مجھے وہ اسمگل کر دیا جو کہ مجھے چاہیے تھا۔

اور پھر میں نے اس کا منہ بند کر دیا کیونکہ ویسا کرنا ضروری تھا۔

بھروسہ کسی پر بھی نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اسے یہ سیکھ دی تھی جو کہ اگر اسے دوسری زندگی ملی تو اسے ہمیشہ یاد رہے گا۔



"میں بھروسہ نہیں کرتی۔ کیونکہ اس سے انسان کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کو اس شکار سے بھی زیادہ لاچار بنا دیتا ہے جو میرے باتھ روم کے فرش پر تڑپ رہے ہوتے تھے۔"

وہ میری بات تحمل سے سن رہا تھا۔

ہمارے اب تک کے تمام انٹرویوز میں میں بولتی تھی اور وہ سنتا تھا۔

میں نے اسے اپنے ذہن کے ان تاریک کونوں تک رسائی دی تھی جن میں میرے گہرے راز مدفن تھے، وہ الگ بات تھی کہ وہ کبھی ان رازوں پر سے پردہ نہیں ہٹا سکا۔

"مگر میں نے اس پر بھروسہ کیا۔ جو میری غلطی تھی، اور پھر میں نے اس کا ازالہ کیا۔ کیونکہ اس کا یہ جاننا ضروری تھا کہ وہ میرے ارادوں کو نہیں بدل سکتا۔ وہ مجھے کمزور تصور کر کے بہت بڑی غلطی کر چکا تھا۔"



کل نیوز پر ایک اور لڑکی کی لاش ملنے کی خبر چل رہی تھی۔

اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ شکار پر اچانک جھپٹنا اسے کتنا حیران کر دیگا۔

دو سال سے میں اس دن کا انتظار کر رہی تھی۔ اس تھرل کا۔



سب کچھ محض چند لمحوں میں ہوا تھا۔

باہر تیز بجلی کڑکی تھی۔

ایک لمحے میرے ہاتھ ہتھکڑیوں میں جکڑے زنگ آلود میز پر رکھے تھے۔ اور وہ میرے سامنے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس حملے سے بلکل بے خبر جو کہ اس پر ہونے والا تھا۔

اگلے ہی لمحے میرے ہاتھوں میں چھپا دھاتی نوکدار آلہ اس کی شہ رگ کو کاٹتے ہوئے گزر گیا۔

بجلی کڑکنے کی آواز نے اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ کو دبا دیا۔

اسے صرف چونکنے تک کی مہلت ملی تھی۔ اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھٹتی جا رہی تھیں۔

اس کے لب تھرتھرائے مگر اب اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔

ٹپ ٹپ ٹپ۔

ابر رحمت برسنا شروع ہو گئی تھی۔ آج بادل اپنا بوجھ اتار رہے تھے۔ اور پانی کے ننھے قطریں زمین پر گرتے ساتھ میرے مدفن جرائم کی فہرست میں ایک اور اضافہ کر گئے۔

ہمدان نے چوکھٹ پار کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ وہ بھول گیا تھا کہ جب تم اندھیرے میں جھانکتے ہو تو وہ بھی پلٹ کر تمہیں دیکھتا ہے۔

خون اس کی گردن سے بہتا ہوا اس کی سفید شرٹ کو رنگ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ گردن پر جمے تھے۔ وہ ابھی بھی کچھ کہنے کی سکت کر رہا تھا۔

"میرے آخری شکار کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں شکاری میں ہوں۔"

میں کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

"اور اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔"

میرا لہجہ سرد تھا۔ وہ کمرہ بھی سرد تھا۔ یہاں موت کا رقص چل رہا تھا اور یہ در و دیوار خاموشی سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔

اس کی نگاہوں کا مرکز میں تھی مگر میں جانتی تھی اسے آنکھیں کھلی رکھنے کے لیے کتنی جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی۔

"مجھے بدلاؤ پسند نہیں ہے ہمدان۔ لیکن میرا آخری شکار مختلف ہے۔ تم نے ٹھیک کہا تھا کہ میرے آخری شکار تک میرا طریقہ واردات بدل چکا تھا۔"

آلہ میری گرفت میں تھا۔ اس کی دھار پر ایک سرخ لکیر بنی تھی۔

ہمدان کا جسم ڈھلتے ہوئے فرش پر زمین بوس ہو گیا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ اس کی پتلیوں پر ایک جھلی سی آگئی تھی۔ ہلکی نیلے رنگ کی۔

وہ چھوٹی موٹی عورت ہماری جانب متوجہ ہوئی۔ وہ اس وقت سلاخوں پار سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس چوکھٹ کو پار نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے وہ جیل انتظامیہ کو اطلاع دینے کے لیے دوڑی۔

ہمدان کا سر فرش پر دھرا تھا۔ اس نے وہیں سے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس وقت اس میں اور سکینہ میں کتنی مماثلت تھی۔

بجلی دوبارہ کڑکی۔ اور اس بار جب کمرے میں اجالا پھیلا تو میرے سامنے سکینہ تھی۔ باتھ ٹب میں ڈری سہمی کھڑی، آنکھوں میں خود وہ ہراس کے ملے جلے تاثرات لیے۔

اس نے سلیج ہیمر کے پہلے وار ہونے سے قبل میری جانب اسی التجائی نظروں سے دیکھا تھا۔

اور وہی وہ لمحہ تھا جب سکینہ کی آنکھوں میں میں نے موت کے آخری مرحلے کی جھلک دیکھی تھی۔

ناامیدی۔

اگلے لمحے میں واپس اس گھٹن زدہ چاردیواری میں موجود تھی۔

ہمدان کی آنکھیں مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھیں۔

میں مسکراتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"تمہیں مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"اور تمہیں اپنی منگیتر کو تو بلکل نہیں مارنا چاہیے تھا۔"

میں نے انگلیاں اس کی بند ہوتیں آنکھوں پر رکھیں۔

اپنا چہرہ اس کے کان کے قریب لے جا کر میں نے سرگوشی کی۔

"کیونکہ میں ایسا کبھی نہیں کرتی۔ وہ میری ٹائپ نہیں تھی۔"

میری انگلیوں کے پیچھے اس کی پلکیں جھکنے لگی تھیں۔ وہ نیند کی وادی میں قدم رکھ رہا تھا۔

"فکرمت کرو، میں پولیس کو بتادوں گی کہ تمہارے گھر کے لان یا تہہ خانے کی تلاشی لے لیں۔ انہیں وہ وہیں کہیں مل جائے گی۔ کیونکہ یہ میرا طریقہ واردات ہے۔ تم جانتے ہو میں نے اپنے پسندیدہ شکار کو اپنی کیاری میں دفن کیا تھا۔"

وہ شاید میری بات نہیں سن رہا تھا کیونکہ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

میں نے چہرہ اس کے قریب سے ہٹاتے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

ہمدان کو زندہ انسان سے ایک لاش بننے میں اتنا ہی وقت لگا تھا جتنا مجھے ایک معصوم بے ضرر بچی سے ایک حیوان بننے میں۔

میں نے کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھا۔

بارش زور و شور سے جاری تھی۔ یک دم کمرے کا درجہ حرارت گر گیا تھا۔

میں نے ایک جھر جھری لی۔

میں نے ہمدان سے کہا تھا کہ مرتے وقت میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مرنا پسند کروں گی۔ لیکن ایسا مجھے تب گوارا ہوتا اگر اس وقت موت کی آغوش میں قدم رکھنے والی میں ہوتی، وہ نہیں۔

میں جانتی تھی ہمدان خود غرض تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میں اس سے بڑی خود غرض ہوں۔ ایک شہر میں ایک ہی مشہور سیریل کلر رہ سکتا ہے۔

(میں اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔)

ہاں مجھے وہ پسند تھا۔ مگر میری شکار گاہ کے اصول میرے اپنے ہیں۔

(آلہ قتل میری مٹھی میں تھا۔)

مانا کہ سلیج ہیمر میرا پسندیدہ ہتھیار تھا لیکن ایک قابل شکاری کسی بھی ہتھیار کا استعمال جانتا ہے۔

(میں خراماں خراماں چلتی کھڑکی تک پہنچ گئی۔)

کس نے سوچا تھا میرا آخری قتل اتنا مختلف انداز میں ہو گا؟

(ایک ہاتھ ان سلاخوں سے باہر نکال کر اپنی دائیں ہتھیلی پر نمی محسوس کی۔ میرا ہاتھ اوپر چھت سے بہتے پانی میں دھل رہا تھا۔)

مجھے بدلاؤ پسند نہیں۔

لیکن اس آدمی کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔

اپنا ہتھیار، اپنا طریقہ واردات بدلنے کے لیے بھی۔

(راہداری میں بوٹوں کی آواز گونجی۔)

میدان کی گیلی مٹی کی سوندھی خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ مگر مجھے وہ سوندھی نہیں لگی، بلکہ وہ ایک بُو تھی۔ انسان کے لاش بننے کی بُو۔ موقع واردات کی بُو۔ قتل کی بُو۔

(میں نے آنکھیں موند لیں۔)

اور یہ تھا میرا آخری شکار۔

یا شاید نہیں؟

آخر کو میں ایک pathological جھوٹی ہوں۔

☆☆☆

(تمت بالخیر)